فتح محمد ملک

نظم 'ذوق وشوق' کو سمجھنے کے لیے

فنونِ لطیفہ میں ہنگامی اور آفاقی، وقتی اور دوامی کے پراسرار تخلیقی رشتوں کا سراغ پانے کے لیے اقبال کی نظم 'ذوق وشوق' کا مطالعہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ نظم کا پہلا مصرع ہی اس بات کا اعلان ہے کہ اس نظم کا موضوع 'قلب ونظر کی زندگی' ہے۔ ہر چند آفاقی جذبات اور دائمی صداقتیں کسی مقام اور وقت کے حوالے سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں، تاہم انہیں اپنے زمانی و مکانی تناظر میں سمجھنے کی ایک اپنی الگ اہمیت ہے۔ یہ نظم ایک دلکش اور خیال انگیز منظر سے شروع ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک نعتیہ فریاد پر آ تمام ہوتی ہے۔ یہ منظر پردۂ وجود کے چاک چاک ہو جانے کی بدولت حسنِ ازل کی بے حجابی اور قلب ونظر میں صبح کے سماں سے عبارت ہے۔ گویا باطنی زندگی میں طلوعِ آفتاب سے گردوپیش کی زندگی کے تمام تر خارجی مناظر نور کی ندیوں میں ڈوب کر کہیں دور، بہت دُور غائب ہو گئے ہیں۔ اس نورانی منظر میں شاعر دیکھنے اور سوچنے لگتا ہے:

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں؟

تخیلِ اقبال کو ان گزرے ہوئے کاروانوں کا تعاقب کرتے کرتے زمانِ مصطفیٰ میں لے جاتا ہے اور وہ یوں محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جیسے چند لمحوں میں وہ مدینۃ النبیؐ میں ہوں گے۔ ایسے میں:

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

چنانچہ اقبال کے تخیل کا رہوار وہیں رُک جاتا ہے اور اقبال آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ دیتے ہیں:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
ذکر عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصورات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہ گویا اپنے زمانے کی ملتِ اسلامی کا تنقیدی محاکمہ ہے۔ ان اشعار پر اگر ان کے تاریخی تناظر میں غور کیا جائے تو ان کا مفہوم بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اقبال پر یہ نظم ۱۹۳۱ء میں قیامِ فلسطین کے دوران وارد ہونا شروع ہوئی تھی۔ اقبال فلسطین میں براستہ لندن پہنچے تھے۔ لندن میں وہ دوسری گول میز کانفرنس (۷ ستمبر تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں مسلمان مندوب کی حیثیت میں شریک ہوئے تھے۔ یہ کانفرنس مستقبل کے آزاد ہندوستان کے لیے ایک وفاقی آئینی ڈھانچہ تعمیر کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ کم وبیش ایک سال پہلے اقبال اپنے

خطبۂ الٰہ آباد میں برصغیر ہند کے لیے زیرِ غور وفاقی آئین کے تصور کو رد کر کے برصغیر میں جداگانہ مسلم مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کر چکے تھے۔ چناچہ اس گول میز کانفرنس میں شامل پیشتر مسلمان مندوبین کا برطانیہ نواز رویہ بھانپ کر وہ کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے[1]۔ گول میز کانفرنس کے بعد فلسطین میں اُنہیں مؤتمر عالمِ اسلامی کے منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ چنانچہ وہ فرانس میں برگساں اور لوئی مسینیوں اور اٹلی میں مسولینی اور افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان سے ملاقات کے بعد ۶ ردسمبر کو بیت المقدس پہنچ گئے۔ گول میز کانفرنس کی طرح مؤتمر عالمِ اسلامی کی کانفرنس سے بھی وہ کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی ۱۵ ردسمبر کو واپس چلے آئے۔ اس ۹ روزہ قیام کے دوران اُنہوں نے فلسطین کی سیر کے ساتھ ساتھ مؤتمر کے اجلاسوں میں مسلمان ملکوں کے حکمران طبقے کے اعلیٰ ترین نمائندوں سے ملاقات کی اور روانگی سے ایک روز پیشتر کانفرنس سے انگریزی میں خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں جہاں اُنہوں نے ملتِ اسلامی کو درپیش خطرات کی نشاندہی کی وہاں اُنہوں نے دُنیائے اسلام کے سیاسی اور تہذیبی رہنماؤں کو دِل سے مسلمان بننے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے خبردار کیا کہ:

> ''اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک مادی الحاد کی طرف سے ہے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روحِ طاہر ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بری چیز نہیں ہے، لیکن اگر اس میں اعتدال کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی پیدا کر دینے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں، مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ ہے،

---

[1] بحوالہ خطبۂ صدارت، کل ہند مسلم کانفرنس، منعقدہ لاہور، ۱۹۳۲ء۔

لیکن خود مسلمانوں سے بھی مجھے اندیشہ ہے۔ میں تو جب بھی سوچتا ہوں شرم وندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول ﷺ ہم پر فخر کریں؟ ہاں! جب ہم اس نور کو اپنے دِلوں میں زندہ کرلیں گے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہوسکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں[1]۔''

اقبال کی اس گفتگو کی روشنی میں اگر ہم اوپر دیئے گئے اشعار کو ایک مرتبہ پھر پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نظم کا فوری محرک وہ گہری مایوسی ہے جس نے مؤتمر عالمِ اسلامی کے اجلاس کے دوران اقبال کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہاں اقبال کو دُنیائے اسلام کے سیاسی زعماء، علمائے دین اور دانشورانِ کرام سے بالمشافہ ملاقاتوں اور مؤتمر کے اجلاسوں میں اُن کے طرزِ فکر واظہار سے براہِ راست شناسائی کا موقع ملا تھا۔ یہاں کی باتیں اور ملاقاتیں اُن کے لیے مایوس کن ثابت ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُن کی تمامتر تخلیقی شخصیت ایک مقدس بے چینی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ احساس کہ دجلہ وفرات کے کنارے حق و باطل کے درمیان صف آرائی جوں کی توں موجود ہے مگر قافلۂ حجاز میں کوئی حسینؓ نظر نہیں آتا۔ یوں کہیے کہ مسلمان حکمرانوں میں ایک سے ایک بڑھ کر شاہ حسین تو موجود ہے مگر امام حسینؓ بننے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ علمائے دین اور مفتیانِ شرع متین کا حال حکمرانوں سے بھی بدتر ہے۔ عشق کی آگ بجھ چکی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی خاکستر یہاں وہاں اُڑتی پھرتی ہے اور شرع و دین خیالات کا بت کدہ بن کر رہ گئے ہیں:

عقل و دِل و نگاہ کا مرشدِ اوّلین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بت کدۂ تصورات

مؤتمر سے اپنے الوداعی خطاب کی مانند اس نظم میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ ملتِ اسلامی اس وقت جس تہ در تہ تاریکی میں پڑی اونگھتی ہے، اسے صرف عشق ہی کی روشنی سے منور

---

[1] حمزہ فاروقی، سفرنامۂ اقبال، اقبال اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۴۲۔

کیا جا سکتا ہے۔ اس جدوجہد کا آغاز اہلِ حرم کے سومنات... خود مسلمانوں کے بت کدۂ تصورات کی تخریب وتباہی کے بغیر ناممکن ہے۔ چنانچہ اقبال کے دِل میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ:

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

یہ احساس کہ اقبال کے عہد کا ''مسلمان اس قابل نہیں کہ رسول کریم ﷺ اس پر فخر کرسکیں''، اقبال کو بصد عجز وندامت بارگاہِ مصطفیٰ میں لے جاتا ہے اور یوں نظم کا باقی ماندہ حصہ آنحضور ﷺ سے راز و نیاز بن کر رہ جاتا ہے۔ ماضی مستقبل بننے کو بے چین ہو جاتا ہے:

تازہ مرے وجود میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

اس نظم کے فوری محرکات کی تلاش میں نکلیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دُنیائے اسلام کا حکمران طبقہ ابولہب کی پرستاری پر نازاں ہے۔ ایک فارسی نظم میں اقبال نے عرب وعجم ہر دو خطہ ہائے زمین میں ابولہب کو ارزاں اور مصطفیٰ کو نایاب بتایا ہے۔ اپنی نظم ''انقلاب اے انقلاب!'' میں وہ دُنیائے اسلام کو خبردار کرتے ہیں کہ:

در کلیسا ابنِ مریم را ببدار آویختند
مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کرد با اُم الکتاب

انقلاب!

انقلاب، اے انقلاب!

نظم ''ذوق وشوق'' محمد مصطفیٰ ﷺ کی تلاش کی دین ہے۔ اس تلاش کا نقطۂ آغاز مسلمانوں کے سیاسی اور دینی بتکدوں پر غزنوی بن کر ٹوٹ پڑنے سے عبارت ہے۔ اقبال کی نظر میں مؤتمر عالمِ اسلامی بھی ایک ایسا ہی بتکدہ ہے۔ جب دوسری مرتبہ اقبال کو مؤتمر کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اُنہوں نے یہ سوچ کر اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ تو فرنگی سامراج ہی کا ایک ادارہ ہے۔ مؤتمر کے استعماری کردار کی یہ بات بیشتر

مسلمانوں کو ناقابلِ یقین نظر آئے گی۔ اس لیے میں یہاں ڈاکٹر تاثیر کی ایک تحریر سے ایک طویل اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

''جس ملاقات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس میں ایک اور بات بھی جو قابلِ ذکر ہوئی تھی، اس کا تعلق سیاسیات سے بھی ہے اور علامہ اقبال کی اپنی ذات سے بھی۔ ڈاکٹر صاحب کو آکسفورڈ سے روڈز لیکچر دینے کی دعوت آئی۔ میں ان دِنوں کیمبرج میں تھا اور ڈاکٹر صاحب کو اصرار سے لکھا کہ وہ اس دعوت کو ردّ نہ فرمائیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کا سفر انگلستان سیاسی حیثیت رکھتا تھا۔ روڈز لیکچر کی علمی حیثیت تھی۔ انگلستان کے ادیب اور اہلِ علم لوگوں نے زمان و مکان کے مسئلے کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معلوم کرنا چاہا۔ ڈاکٹر صاحب نے زمان و مکان کے اسلامی تصور پر لیکچر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان لیکچروں کا پہلے سے چرچا کر رکھا تھا۔ ذاتی اور قومی فخر کے ساتھ اقبال کے ادبی مرتبہ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں یقین دِلایا کہ میں ضرور آؤں گا لیکن یکا یک ان کا ایک اور خط آیا اور اس میں لکھا کہ اُنہوں نے ارادہ منسوخ کر دیا ہے۔ مجھے اس کا بہت رنج ہوا۔ اس ملاقات میں وہ راز بھی منکشف ہوا۔ روڈز لیکچر کی دعوت لارڈ لوتھین کے ذریعے آئی تھی۔ لارڈ لوتھین علامہ کا بہت مداح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے کیمبرج میں ایک ملاقات کے دوران، میں مجھ سے کہا تھا: ''عالمِ اسلامی ہی میں نہیں، تمام مشرق میں اقبال جیسا اثر انداز مفکر اور کوئی نہیں۔'' یہ بھی کہا کہ: ''اقبال کے افکار تاریخِ عالم کا رُخ بدل دیں گے سیاسی لوگ نہیں جانتے کہ اقبال کی طرح کے شاعر کس قدر مؤثر ہو سکتے ہیں۔''

اسی لوتھین نے علامہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فلسطین آ کر مؤتمر اسلامی میں شریک ہوں اور اسلامی ممالک تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ بظاہر یہ اچھی بات تھی۔ علامہ اقبال نے وعدہ کر لیا لیکن اُنہیں بہت جلد اس کا احساس ہو گیا کہ یہ مؤتمر برطانوی سامراج کی کرشمہ سازی کا نتیجہ تھی۔ اقبال برطانوی سامراج کا سخت دشمن تھا۔ روڈز لیکچر اور اس مؤتمر کی تاریخیں پاس پاس تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مروت کے پتلے تھے۔ وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ ممکن ہوا تو مؤتمر میں شریک ہوں گے۔ مؤتمر سے بچنے کا یہی طریقہ نظر آیا کہ آکسفورڈ نہ جائیں[1]۔''

جناب حمزہ فاروقی نے اپنی کتاب ''سفرنامۂ اقبال'' میں اس بات کا انکشاف بھی فرمایا ہے کہ عرب نوجوان میں مؤتمر کے انعقاد کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کے نمائندے بھی اس کے ممکنہ نتائج سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ میں جب ایک رکن نے اپنی تقریر میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ مجوزہ کانفرنس میں مسلمان مندوبین کی تقریروں سے ''یہود و نصاریٰ کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہوں گے۔'' تو وزیر نوآبادیات سر رابرٹ ہیملٹن نے جواب دیا تھا کہ:

''مجھے اس قسم کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے جذبات مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہائی کمشنر سے تحقیقات کرنے پر مجھے علم ہوا ہے کہ مفتی اعظم کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور وہ کانگرس کی کارروائی ایسے طریق پر انجام دیں گے کہ برطانوی یا فلسطین کی حکومت کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''[2]

مؤتمر کی افسردہ و مردہ قراردادوں سے بھی اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ آج ہی

۱۔ ڈاکٹر تاثیر، اقبال کے حضور، رسالہ فنون، (۲۱ر جون ۱۹۷۵ء)، ص ۱-۴۔

۲۔ حمزہ فاروقی، سفرنامۂ اقبال، اقبال اکادمی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۸۔

نہیں بلکہ اپنے آغاز میں بھی یہ موتمر ایسی ہی بے جان اور پرفریب تنظیم تھی۔ ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کے عکس پر ینگ مین مسلم ایسوسی ایشنوں کے قیام سے لے کر جدید عربی لغت کی تیاری اور حجاز ریلوے تک اس کی قرار دادوں میں کہیں بھی عشق کی آنچ محسوس نہیں ہوتی۔ اقبال نے بہت اچھا کیا کہ کانفرنس کی تکمیل سے پہلے ہی مندوبین کو اپنی آستینوں میں چھپائے ہوئے بتوں کو توڑنے کا مشورہ دے کر لاہور واپس آ گئے۔ یہ ہے وہ تاریخی، سیاسی اور تہذیبی تناظر جس کے بغیر ''ذوق وشوق'' کی تفہیم وتحسین ناممکن ہے۔

جولوگ مسلمان ممالک میں سیاہ وسفید کے مالک ہیں، اُن میں سے کچھ جان بوجھ کر اور کچھ بے جانے بوجھے مغربی سامراج کے سیاسی آلۂ کار بنے بیٹھے ہیں۔ ایسے میں اقبال کی اُمیدوں کا مرکز وہ مسلمان نوجوان ہیں جن کا ذکر اُنھوں نے مؤتمر سے اپنے الوداعی خطاب میں رجائیت کے ساتھ کیا ہے اور جنھیں نظم ''ذوق وشوق'' میں ''ذرۂ ریگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنے زمانے کی دُنیائے اسلام کی بے آب وگیاہ، بنجر اور تہ در تہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی خارجی زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر اقبال ''قلب ونظر کی زندگی'' کا رُخ کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے غلام ماضی کی صدیوں کو پھلانگتے ہوئے واپس اسلام کے قرنِ اوّل میں جا پہنچتے ہیں اور رسولِ اکرم ﷺ کے حضور عرض گزارتے ہیں:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر گردشِ آفتاب سے